بنیاد جلد ۵، ۲۰۱۴ء

شیراز فضل داد *

مجید امجد کی شاعری میں سماجی حسیت

مجید امجد (۲۹ جون ۱۹۱۴ء۔۱۱ مئی ۱۹۷۴ء) پنجاب کے ایک نسبتاً پس ماندہ علاقے جھنگ میں پیدا ہوئے[۱]۔ابھی دو ڈھائی برس کے تھے کہ اُن کے والد نے دوسری شادی کر لی اُن کی والدہ نے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا اور مجید امجد کو لے کر اپنے میکے چلی آئیں۔مجید امجد کے نانا ایک مذہبی عالم تھے اور ساتھ ہی اچھا ادبی وشعری ذوق رکھتے تھے۔اُن کے ماموں بھی فارسی، عربی اور اُردو میں شاعری کرتے تھے اور سکول میں فارسی کے اُستاد تھے۔یوں ننھیال میں مجید امجد کو مذہبی علم اور ادبی ذوق دونوں میسر آئے۔مذہب کے معاملے میں اُن کا ننھیال قدامت پرست نہیں تھا بلکہ ترقی پسندانہ رجحانات کا حامل تھا اور جدید تعلیم کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مجید امجد کو روایتی مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم بھی دلوائی۔نانا اور ماموں کی صحبت کا اثر تھا کہ مجید امجد نے طالب علمی کے زمانے میں ہی شعر کہنا شروع کر دیے۔

مجید امجد نے اپنی زندگی کا آغاز نامساعد حالات میں کیا۔پوری دنیا اقتصادی بحران سے گذر رہی تھی اس لیے اچھی ملازمت اور خاص طور پر اچھی سرکاری ملازمت ملنا آسان نہ تھا؛ لہٰذا اپنی قابلیت اور تعلیم کے مطابق ملازمت نہ ملنے کے باعث معمولی قسم کی ملازمتوں کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ابتدا میں انھوں نے کلرک کی نوکری بھی کی۔[۲] مجید امجد داخلیت پسند انسان تھے زندگی کے معاملے میں ان کی

شیراز فضل داد

حکمتِ عملی یہ تھی کہ ان کے پیشِ نظر یہ نہیں تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں بلکہ جو آسانی سے مل گیا اسے قبول کر لیا۔ شاعری کے سلسلے میں بھی ان کا سفر روایتی موضوعات اور اسلوب سے شروع ہوا اور ان کا ابتدائی کلام مروجہ روایات سے بہت مطابقت رکھتا تھا۔ لیکن بعد میں اس سفر میں بہت سے فکری و فنی تغیرات آتے رہے۔ ان کا فکری ارتقا کسی تحریک یا کسی گروہ کے زیرِ اثر نہیں تھا بلکہ ان کی اپنی داخلی اور ذاتی فکر کی بنا پر ہوا۔ انھوں نے فنی و فکری ہر دو سطح پر نت نئے تجربات کیے، ان تجربات کی بنا پر رونما ہونے والا ارتقا بہت واضح دکھائی دیتا ہے بلکہ یہ ارتقا جدید شاعری کی روایت کی صورت میں سامنے آیا۔

مجید امجد کا شعری سفر تقریباً بیالیس برس پر مشتمل ہے۔ ان کا تعلق جس عہد سے ہے اس عہد میں عالمی سطح پر اتنی تیزی سے تبدیلیاں آرہی تھیں کہ زندگی کی قدریں اور معیارات بدل رہے تھے۔ شاعر اور ادیب اس دور کی مجموعی فضا سے بہت متاثر تھے، اس دور کی فضا اور حالات کے زیرِ اثر مختلف قسم کے رویے جنم لے رہے تھے۔ ان رویوں کے مطابق دو بنیادی گروہ سامنے آئے ایک وہ گروہ تھا جو معاشرے کی اصلاح کے لیے کاوشیں کر رہا تھا انھوں نے ادب میں مقصدیت کا علَم تھام رکھا تھا وہ لوگوں کو سیاسی صورتِ حال اور سماج دشمن طاقتوں سے آگاہ کر رہے تھے اور دوسری طرف مغربی فکر کے زیرِ اثر رومانوی رجحانات نمایاں ہو رہے تھے۔ مجید امجد کا ابتدائی کلام اس دور کے چند رومانوی پرچوں میں بھی چھپتا رہا جن میں اختر شیرانی کا پرچہ رومان اور جوش کا پرچہ کلیم قابلِ ذکر ہیں۔[۳]

مجید امجد باقاعدہ کسی ادبی جماعت یا کسی بڑے ادبی مرکز کا حصہ نہ تھے لیکن وہ جس ماحول اور فضا میں سانس لے رہے تھے اس سے لاتعلق بھی نہیں رہ سکتے تھے اس لیے ان کی شاعری میں جا بجا اس دور کے مجموعی اثرات نظر آتے ہیں۔ تاریخ کا جبر، طبقاتی تفاوت، عمرانی سماجی شعور، معاشی و اقتصادی بحران اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے رویے، جنگ کی تباہ کاریاں اور بعد کی زندگی میں اس کے اثرات اور ارضیت کے تمام پہلو ان کے کلام میں موجود ہیں۔

مجید امجد کی شاعری میں فطرت نگاری کا گہرا رنگ نظر آتا ہے لیکن ان کے ہاں تمام مظاہر فطرت، اشیا اور خود انسان کا اظہار اس کے گرد و نواح اور اس کے ماحول کے حوالے سے ہوتا ہے اور ان تمام چیزوں کے درمیان ایک رشتہ ہے۔ یہ سب معاشرے میں نظر انداز ہونے کے باعث گہرے دکھ

میں مبتلا ہیں۔ مجید امجد کی شاعری میں جو حزن و ملال اور کرب ہے وہ سب اس صورتِ حال کے باعث جنم لیتا ہے جو زندگی گذارنے کے دوران پیش آتی ہے اور زندگی کا صحیح معنوں میں ادراک بھی اس صورتِ حال کے باعث ہوتا ہے۔

مجید امجد کی شاعری کا ایک اہم پہلو ان کی سماجی حسیت ہے۔ وہ جس معاشرے میں رہتے تھے، اس کے تمام نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ تھے، وہ جانتے تھے معاشرتی اور اخلاقی اقدار کس رُخ میں سفر کر رہی ہیں اور اس کے باعث کیا کیا مسائل جنم لے رہے ہیں اور حالات کیسے بدل رہے ہیں۔ انھوں نے معاشرتی مسائل اور سماجی رویوں کو اپنے تجربات کے حوالے سے دیکھا۔ کوئی بھی شاعر، ادیب یا فنکار اپنے عہد کی عصری تبدیلیوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا لہٰذا مجید امجد نے بھی اپنے گرد و نواح میں رہنے والوں کے حالات، مسائل، عادات و اطوار کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ خوب صورت پیرائے میں اس کا اظہار بھی کیا مثلاً پنواڑی معاشرے کا ایک عام فرد یا ایک انتہائی معمولی طبقے کا نمائندہ ہے اور شاید کبھی کسی نے اس کو ایک پان بیچنے والے سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہو گی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ بھی ایک انسان ہے اور معاشرے کا ایک فرد ہے۔ مجید امجد نے ''پنواڑی''[۴] کے عنوان سے نظم میں پنواڑی اور اس جیسے دیگر افراد کی پوری زندگی کا نقشہ کھینچا ہے جن کی زندگی کی حیثیت ایک پروانے کی زندگی سے زیادہ نہیں۔ جیسے ہر رات شمع کے گرد منڈلانے والے پروانے جلتے مرتے رہتے ہیں اور دوسرے پروانے ان کی جگہ لے لیتے ہیں اور کبھی کوئی ان پروانوں کی کمی محسوس نہیں کرتا ویسے ہی غریب انسان زندگی کی ضروریات کو حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا جاتا ہے اور اس کے نہ ہونے سے بھی کبھی کسی کو اس کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ گرد و نواح میں بسنے والے اور نظر آنے والے دیگر افراد کے بارے میں بھی وہ اسی طرح محسوس کرتے اور اس کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً ''بھکارن''[۵] اور ''ایک ایکٹرس کا کنٹریکٹ''[۶] میں ان دو طبقات کی عورت کو موضوع بنایا ہے جو ایک اٹل حقیقت کی طرح موجود تو ہیں لیکن معاشرے میں کوئی باعزت مقام حاصل نہیں کر سکتیں۔ ایک فرد کی معاشرتی زندگی یا معاشرے کے ساتھ تعلق اس کے گھر اور قریبی رشتوں سے شروع ہوتا ہے اور پھر اس کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اس لیے کئی مسائل کا تعلق بھی گھر اور رشتوں سے ہوتا ہے۔ ہمارے گرد و نواح میں کئی گھروں

میں کوئی نہ کوئی یتیم موجود ہوتا ہے جو اپنے چچا، ماموں، پھوپھی یا اس قسم کے کسی رشتے کے زیر سایہ پل رہا ہوتا ہے۔ان بچوں کے کئی مسائل ہوتے ہیں مجید امجد نے بھی ایک ایسی لڑکی کی کہانی بیان کی ہے جس کی ماں مرچکی ہے، اس کا باپ کسی دور دراز علاقے میں مزدوری کرتا ہے اور وہ لڑکی اپنی چچی کے رحم وکرم پر رہتی ہے۔

کیوں نہ ہو اس دکھ کی ماری کے لیے جینا وبال　　　اِک چچی کے ہاتھ میں جس کے گھر کی دیکھ بھال

مجید امجد نے اپنے معاشرے کے ہر پہلو کا بہت گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے۔ زندگی کی سنگینیوں اور مشکلات کو انھوں نے مختلف حوالوں سے دیکھا۔کبھی ان مسائل کو انھوں نے غریب طبقے کی زندگی کے حوالے سے پیش کیا،کبھی کسی یتیم کے مسائل کے حوالے سے اور کبھی رسم و رواج کی گھٹن کے حوالے سے۔مثلاً ایک نظم میں ایک شادی شدہ لڑکی اپنی سہیلی کو خط لکھتی ہے جس کی شادی ہونے والی ہے۔وہ رسم رواج کے اس طوق کو جو اس کے اپنے گلے میں ہے اپنی سہیلی کے گلے میں نہیں دیکھنا چاہتی اوراس گھٹن کی زندگی پر وہ آزادی سے مرنے کو ترجیح دیتی ہے۔

آہ ! یہ دکھ بھرا نظامِ حیات　　　جس کے پنجے میں تلملاؤ گی
آہ ! یہ طوق رسم و راہِ جہاں　　　جس کو زیب گلو بناؤ گی

مجید امجد کے سماجی شعور کا ایک پہلو طبقاتی شعور بھی ہے۔ معاشرہ بہت سے طبقات میں بٹا ہوا ہے۔طبقاتی تفاوت صرف ہمارے معاشرے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ پوری دنیا کا انسان کہیں پیشوں کے اعتبار سے اور کہیں اپنی مالی حیثیت کے باعث مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔اس طبقاتی شعور نے مجید امجد کی شاعری میں بغاوت کا جذبہ بھی پیدا کیا۔انھوں نے متوسط اور نچلے طبقے کے لوگوں کے مسائل بیان کیے ہیں،بیواڑی، بھکارن، تانگے بان، بالا، گداگر، مزدور اور اس طرح کے کئی دوسرے کردار جو مجید امجد کی نظموں میں نظر آتے ہیں ان کا تعلق معاشرے کے نچلے طبقے سے ہے جہاں زندگی بذاتِ خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ مجید امجد کے اس کرب کی شدت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ جنگلوں یا بیابانوں کو دیکھ کر اس بات پر مطمئن ہیں کہ یہاں پر کم از کم زندگی طبقات میں منقسم نہیں ہے، پرندے آزادی سے ہر پیڑ پر گھونسلا بنا سکتے ہیں، مٹی کی زرخیزی، ہوائیں، بارش سب درختوں کے لیے ایک جیسے ہیں۔

ان وسعتوں میں کلبہ و ایواں کوئی نہیں　　　ان کنکروں میں بندہ و سلطاں کوئی نہیں

لیکن انسانوں کی دنیا میں ایسا نہیں ہے یہاں قدم قدم پر انسان دائروں میں تقسیم شدہ ہے۔ ہر انسان کے لیے زندگی کا مفہوم مختلف ہے۔''طلوعِ فرض''[۷] کا مرکزی کردار جب صبح سویرے اپنی نوکری پر جانے کے لیے نکلتا ہے تو راستے میں وہ مختلف کرداروں کو دیکھتا ہے اور ان کے درمیان طبقاتی فرق کو بہت شدت سے محسوس کرتا ہے وہ ان کرداروں کو بھی دیکھتا ہے جن کا مقصد صرف آنے والے دن کے لیے روٹی حاصل کرنا ہے اور ان کو بھی جن کے لیے عام آدمی کی حیثیت گردِ راہ سے زیادہ نہیں ہے۔یہی فرق ''کلبہ وایوان''[۸] میں بھی دکھائی دیتا ہے۔اس میں انھوں نے دولت مند طبقے کی بے حسی کا غربت سے موازنہ کیا ہے۔غریب کے پاس دولت کی کمی تو ضرور ہوتی ہے لیکن احساس اور جذبے کی کمی نہیں ہوتی۔

وہ چھپر اچھے، جن میں ہوں دل سے دل کی باتیں
ان بنگلوں سے جن میں بسیں گونگے دن، بہری راتیں

''محرومِ ازل''[۹]، ''کبھی کبھی وہ لوگ''[۱۰]، ''یہی دنیا''[۱۱]، ''کارِ خیر''[۱۲]، ''پھولوں کی پلٹن''[۱۳] میں بھی یہ طبقات اپنی مخصوص خصوصیات کے ساتھ بہت واضح فرق کے ساتھ نظر آتے ہیں۔وہ ناانصافی کے خلاف نہ صرف معاشرے کو قصور وار ٹھہراتے ہیں بلکہ کبھی کبھی خدا سے بھی شکوہ کرتے ہیں کہ اس نے یہ کیسی دنیا بنائی ہے جہاں پر بے شمار معاشی مسائل ہیں، تمام عمر لوگ روٹی کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔کبھی وطن کے نام پر جنگ ہوتی ہے کبھی مذہب کے نام پر اور بے شمار لوگ ان جنگوں کا شکار ہو جاتے ہیں،کبھی رسم و رواج اور کبھی تہذیب کے نام پر انسانیت کی تذلیل ہوتی رہتی ہے۔

جس جگہ دہقاں کو رنج محنت و کوشش ملے　　　اور نوابوں کے کتوں کو حسین پوشش ملے
تیرے شاعر کو یقیں آتا نہیں، ربّ العلا!　　　جس پہ تو نازاں ہے اتنا، وہ یہی دنیا ہے کیا

مجید امجد کے عہد میں جہاں عالمی سطح پر بہت سی تبدیلیاں اور انقلابات آرہے تھے وہیں برِعظیم پاک وہند میں بھی ہر سطح پر تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ان تبدیلیوں کے نتیجے میں یہ خطہ برطانوی تسلط سے آزاد ہوا، ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا عمل میں آنا ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔آزادی حاصل

کر لینا ایک دن کا عمل نہیں تھا اس کے پیچھے وہ تبدیلی تھی جو سوچ اور رویوں سے شروع ہوئی اور غلامی کے خلاف بغاوت اور جدوجہد آزادی کی صورت میں سامنے آئی۔ تبدیلی کی اس تحریک کو مجید امجد نے بھی محسوس کیا اور ''لہر انقلاب کی''[۱۴] کی صورت میں یوں بیان کیا۔

پھر جاگ اٹھا ہے جذبۂ آزادیِ وطن تعبیر اور کیا ہو غلامی کے خواب کی

مجید امجد نے انقلاب کی لہر کو بھانپ لیا اور وطن کے نوجوانوں کو محنت کرنے اور مسلسل آگے بڑھنے کے لیے متحرک بھی کیا اور ان امور کی نشان دہی بھی کی جن کی وجہ سے اس قوم پر غلامی مسلط کی گئی اور جن اطوار کو چھوڑ کر دوبارہ آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ قیامِ پاکستان ایک خوب صورت خواب تھا جو ہر اس شخص نے دیکھا جو آزادی کی قدر و قیمت جانتا تھا، لیکن تعبیر اتنی خوب صورت نہ تھی۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی سیاست کے میدان میں اکھاڑ پچھاڑ ہونے لگی، جنگ کے بادل ہمیشہ اس ملک پر لہراتے رہے اور ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو دو بڑی جنگوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جنگ میں فتح ہو یا شکست اس سے قطع نظر جنگ بذاتِ خود ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔ قومی و انفرادی ہر دو سطح پر۔ مجید امجد نے اس تناظر میں کئی نظمیں کہیں مثلاً ۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے ''خطۂ پاک''[۱۵]، ''سپاہی''[۱۶]، ''یہ قصہ حاصلِ جان ہے''[۱۷]، ''چہرۂ مسعود''[۱۸]، ''ننھے بچو''[۱۹] اور ''تینوں رب دیاں رکھاں''[۲۰] ایسی نظمیں ہیں جن میں انھوں نے آزادی کی قدر و قیمت کے ساتھ ساتھ ان جیالوں کو سلام پیش کیا جنھوں نے اپنے وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان دے دی لیکن وطن کی حرمت پر آنچ نہیں آنے دی۔

کیسے لوگ تھے خود تو اپنے لہو میں ڈوب گئے
لیکن اس مٹی پر آنچ نہ آنے دی
جس پر آج تمھاری آرزوؤں کے باغ مہکتے ہیں

۱۹۷۱ء کی جنگ نے پاکستانی عوام کو دوہرے صدمے سے دوچار کیا کیونکہ اس جنگ کے مابعد اثرات تو اپنی جگہ تھے ہی لیکن ساتھ ہی مشرقی پاکستان کی علاحدگی ایک بہت بڑا سانحہ تھا جو پاکستان کے لیے صرف سیاسی سطح کا نقصان یا زمین کے ایک ٹکڑے کا زیاں نہیں تھا بلکہ عوام کے لیے جذباتی سطح پر بہت بڑا نقصان تھا۔ ابھی وہ زخم بھی مندمل نہیں ہوئے تھے جو ۱۹۴۷ء کی ہجرت کے نتیجے میں آئے تھے۔ اس وقت بھی بہت سے خاندان اپنوں سے بچھڑ گئے تھے اور اب پھر ایسا وقت آ گیا تھا

کہ عوام کو اپنوں کی جدائی کا دکھ سہنا پڑ رہا تھا۔

دیکھنے والے یہ نظارا بھی دیکھ عزم بھی، امتحان بھی، ہم بھی

''اے قوم''[۲۱]، ''ہم تو سدا''[۲۲]، ''۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ء''[۲۳]، ''ریڈیو پر ایک قیدی''[۲۴]، ''۸ جنوری ۱۹۷۲''[۲۵]، ''جنگی قیدی کے نام''[۲۶]، ''میلی میلی نگاہوں۔۔۔''[۲۷] اور ''دکھیاری ماؤں نے''[۲۸] یہ سب ایسی نظمیں ہیں جن کے پس منظر میں ۱۹۷۱ء کی جنگ ہے۔ ان میں سے بیشتر نظموں میں شاعر نے جنگ کے خوف، کرب، جوانوں کی شہادت، اپنوں کی جدائی، موت اور زندگی کے ادھورے پن کے علاوہ جس چیز کا ذکر کیا ہے وہ اربابِ اختیار کی بے حسی ہے۔ ان نظموں میں دکھ اور ہمدردی کے جذبات بہت شدید اور گہرے ہیں۔

ہم کب زندہ ہیں
اپنی اس چکیلی زندگی کے لیے تیری مقدس زندگی کا یوں سودا کر کے
کب کے مر بھی چکے ہم

جنگ چاہے کسی بھی وجہ سے لڑی جائے اس کے مقاصد جو بھی ہوں اس کے نتائج بہت ہولناک ہوتے ہیں۔ جنگ ہمیشہ مسائل کا حل نہیں ہوتی لیکن ہمیشہ مسائل کو جنم ضرور دیتی ہے۔ انفرادی و اجتماعی دونوں سطحوں پر بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اجتماعی مسائل کے حل کے لیے تو کوششیں بھی کی جاتی ہیں اور اجتماعی زندگی کی بحالی کے لیے اقدامات بھی ہوتے ہیں لیکن انفرادی سطح پر لوگوں کی زندگیوں میں کئی ایسے نقصانات ہوتے ہیں جن سے اربابِ اختیار اور معاشرے کے دوسرے لوگ بالکل بے خبر ہوتے ہیں، صرف وہ شخص اس اذیت کی نوعیت کو جان سکتا ہے جو اس سے گذر رہا ہو۔

اس سپاہی کا وہ اکلوتا یتیم
آنکھ گریاں، روح لرزاں، دل دو نیم
بادشہ کے محل کی چوکھٹ کے پاس
لے کے آیا بھیک کے ٹکڑے کی آس

''قیدی دوست''[۲۹]، ''قیصریت''[۳۰] اور ''روداد زمانہ''[۳۱] جیسی نظموں میں مجید امجد نے

جنگ کے بعد فرد اور اجتماع کی زندگیوں میں آنے والے طوفان کی نشان دہی کی ہے۔

مجید امجد نے تہذیبی زندگی کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ انسانی رویوں میں آنے والی منفی تبدیلیوں اور اقدار وروایات کے مٹتے ہوئے نقوش کو انسانی تہذیب کا زوال قرار دیا۔ انسان اپنی مادی زندگی میں ترقی کے لیے فطری زندگی کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ مجید امجد کو فطرت سے بے پناہ لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ جب وہ "توسیع شہر" [۳۲] کی غرض سے درخت کٹتے ہوئے دیکھتے ہیں تو یہ معاشرہ ان کو مقتل کی طرح لگنے لگتا ہے۔

"ہڑپے کا ایک کتبہ" [۳۳]، "ریوڑ" [۳۴]، "گاؤں" [۳۵]، "ریل کا سفر" [۳۶] "بس سٹینڈ پر" [۳۷]، "کل کچھ لڑکے" [۳۸]، "جب اطوار وطیرہ بن جاتے ہیں" [۳۹]، اور "لوگ" [۴۰] ایسی نظمیں ہیں جن میں انسانی رویوں کا ارتقا نظر آتا ہے۔ انسان کو خود بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ کب ایسی باتوں کو اپنا معمول بنا لیتا ہے کہ وہ اخلاقی قدریں جو انسانیت کا اثاثہ ہوتی ہیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے اچھی روایات کو چھوڑ کر ایسے رسم و رواج کا پابند ہو جاتا ہے جن کی وجہ سے وہ اپنے جیسے انسانوں پر ہر روز ظلم کرتا ہے۔

اور اچھے عملوں کی تھیلیوں میں اچھے عمل ھندلا جاتے ہیں
اور وہ سارے ظلم جنم لیتے ہیں جو ہم روز روا رکھتے ہیں!

مجید امجد کی شاعری میں بہت سے تاریخی حوالے بھی ملتے ہیں انھوں نے کسی ایک خطے کی بجائے پوری انسانی تاریخ کو مرکز نگاہ بنایا، کہیں وہ "مقبرۂ جہانگیر" [۴۱] پر کھڑے یہ سوچتے ہیں کہ یہ سلاطین جب زندہ تھے تو انسانیت کی بھلائی کے لیے انھوں نے کیا کیا؟ اور آج یہ بھی تہہ خاک بے بس ہیں کاش یہ زندگی میں انسانیت کے دکھ کو سمجھ سکتے، کہیں وہ "قبلا خان" [۴۲] کی ہیبت کو موضوع بناتے ہیں تو دوسری طرف حضرت زینبؓ [۴۳] اور حضرت امام حسینؓ [۴۴] جیسی تاریخی شخصیات کو بھی موضوع بنایا اور بہت سے تاریخی واقعات کو بھی اپنی نظموں کی اساس بنایا۔

یہی عفریت، خدایانِ جہاں کے اب وجد   زیب اورنگ کہیں، زینتِ محراب کہیں
ان کی شعلہ سی زباں ہے کہ ازل سے اب تک   چاٹتی آئی ہے ان کانپتی روحوں کا لہو

مجید امجد نے سائنسی حقائق کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ "ہوائی جہاز کو دیکھ کر" [۴۵] سائنسی

ایجادات کے باعث پیدا ہونے والی کیفیت اور تاثرات کا اظہار کرتی ہے۔ "۲۹۴۲ء کا جنگی پوسٹر" [۴۶] میں مجید امجد نے ہزار سال بعد کی دنیا کا نقشہ بیان کیا ہے اور اس کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو سیاروں اور ستاروں کے علم سے کافی رغبت تھی۔ "راتوں کو" [۴۷] اور "بس سٹینڈ پر" [۴۸] ایسی نظمیں ہیں جن میں مجید امجد نے کائنات کے آغاز و ارتقا اور انسان کے ارتقا کو موضوع بنایا ہے۔ یہ کائنات آج جس شکل میں ہے، کئی کروڑ سالوں کے ارتقا کا نتیجہ ہے اور ڈارون کے نظریے کے مطابق انسان کی موجودہ شکل بھی طویل ارتقائی عمل کے نتیجے کے طور پر سامنے آئی ہے۔ "میرے خدا میرے دل" [۴۹]، "ہر سال ان صبحوں" [۵۰]، "ان سب لاکھوں کروں" [۵۱]، "برسوں عرصوں میں" [۵۲] اور "خوردبینوں پر جھکی" [۵۳] میں ان کے سائنسی نقطۂ نظر کے کئی حوالے ملتے ہیں۔

مگر توبہ، میری توبہ، یہ انساں بھی تو آخر اِک تماشا ہے
یہ جس نے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا بڑے جتنوں سے سیکھا ہے

مجید امجد اپنی دھرتی سے جڑے ہوئے تھے، اسی لیے ان کو اپنی مٹی کے ہر رنگ سے محبت تھی۔ ان کی شاعری میں جا بجا ارضی حوالے ملتے ہیں۔ چراگاہیں، پگڈنڈیاں، ریوڑ، پیڑ، شاخیں، ٹہنیاں، بن، چڑیا، جنگل، سرکنڈے، آنگن، لاری، پانی کا نلکا، ہری بھری فصلیں، بیساکھ، پڑوس، پھول، باغ، کلیاں، کنواں جیسے لفظ بار بار آتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اپنی زمین سے محبت کرتے تھے وہ اپنی گلی کوچوں، محلوں، چوباروں کا ذکر کرتے ہیں۔ لاہور اور جھنگ کے عنوان سے نظمیں بھی کہیں گو کہ نظم "جھنگ" [۵۴] میں انھوں نے اس شہر کی کوئی تعریف نہیں کی اور بہت گلے شکوے کیے ہیں لیکن ان کے شکوے کا انداز بتاتا ہے کہ یہ سب اپنائیت کی وجہ سے ہے کسی تعصب کے باعث نہیں۔ نظم "گاؤں" [۵۵] میں دیہات کی سادہ اور خوبصورت زندگی کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

یہ سادگی کے رنگ میں ڈوبا ہوا جہاں   ہنگامۂ جہاں ہے سکوں آشنا جہاں

مجید امجد نے اپنی نظموں میں بہت سی علمی، ادبی اور مذہبی شخصیات کو موضوع بنایا ہے۔ ان میں حضرت امام حسینؓ [۵۶]، حضرت زینبؓ [۵۷]، اقبال [۵۸]، حالی [۵۹]، منٹو [۶۰]، مصطفیٰ زیدی [۶۱] شامل ہیں۔ یہ تمام شخصیات مختلف ادوار سے تعلق رکھتی ہیں لیکن مجید امجد کے ان سے متاثر ہونے کی ایک وجہ، ذاتی پسند کے علاوہ، یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان سب نے اپنے اپنے حالات کے مطابق زندگی میں ایک

مثبت تبدیلی اور انقلاب لانے کی کوشش کی اور حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا، حق بات کہی چاہے اس کے لیے کوئی بھی قربانی دینی پڑی۔

وہ شام، صبح دو عالم تھی جب بہ سرحدِ شام　　رکا تھا آ کے ترا قافلہ، ترے خیام!
یہ نکتہ تو نے بتایا جہان والوں کو!　　کہ ہے فرات کے ساحل سے سلسبیل اِک گام

معاشرے میں جبر اور استحصال کو مجید امجد نے بہت شدت سے محسوس کیا۔ انسان کئی سطحوں پر جبر کا شکار ہوتا ہے، ایک عالمی سطح پر سیاسی جبر ہے جو عالمی قوتیں کمزور ممالک پر روا رکھتی ہیں، ایک تقدیر کا جبر ہے اور ایک سماجی اور طبقاتی جبر ہے۔ جبر سماجی رشتوں اور تعلقات میں بھی موجود ہوتا ہے۔ ''جہانِ قیصر وجم میں'' ۶۲، ''رودادِ زمانہ'' ۶۳، ''درسِ ایام'' ۶۴، ''قیصریت'' ۶۵، ''کہانی ایک ملک کی'' ۶۶، ''ہڑپے کا ایک کتبہ'' ۶۷، ''چچی'' وغیرہ میں انسان مختلف قسم کے جبر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا اور غیر انسانی زندگی گذارتا دکھائی دیتا ہے۔

سینۂ سنگ میں بسنے والے خداؤں کا فرمان
مٹی کاٹے مٹی چاٹے ہل کی انی کا مان
آگ میں جلتا پنجر ہالی کا ہے کا انسان

مجید امجد کے کلام میں مذہبی شعور بھی بہت پختہ دکھائی دیتا ہے۔ ابتدائی کلام میں مذہب کے ساتھ ان کی روایتی عقیدت اور احترام کا رشتہ نظر آتا ہے تاہم بعد کے کلام میں کئی سوالات بھی ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ''محبوب خدا سے'' ۶۸، ''حسینؓ'' ۶۹، ''اقبال'' ۷۰، ''خدا، ایک اچھوت ماں کا تصور'' ۷۱، ''نعتیہ مثنوی'' ۷۲، اور ''دُعا'' ۷۳ مذہبی حوالے سے اہم نظمیں ہیں۔

نہیں سمجھے کہ اتنا دور کیوں اس کا بسیرا ہے؟　　وہ اونچی ذات والا ہے اور اونچا اُس کا ڈیرا ہے

مجید امجد کی شاعری میں معاشرتی مسائل، تاریخ، جبر، طبقاتی بُعد اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے مسائل، اقتصادی مشکلات، کرب اور اذیت کے جو تجربات ملتے ہیں سب ان کے عہد کی معاشرت سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے اپنے گرد وپیش میں بکھرے مسائل کو اپنی نظر سے دیکھا خود اس تجربے سے گذرے اور اپنے انداز میں انھیں بیان کیا۔

حوالہ جات

* لیکچرار، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

۱۔ مجید امجد، مدون، خواجہ محمد زکریا، کلیات مجید امجد (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۳۳-۳۴۔
۲۔ ناصر عباس نیر، مجید امجد: شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۲۔
۳۔ سید عامر سہیل، مجید امجد نقشِ گرِ ناتمام (لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۴۳-۱۴۶۔
۴۔ مجید امجد، محولہ بالا، ص ۱۴۔
۵۔ ایضاً، ص ۳۰۲۔
۶۔ ایضاً، ص ۴۱۱۔
۷۔ مجید امجد، "شب رفتہ" کلیات، ص ۷۴۔
۸۔ ایضاً، ص ۷۸۔
۹۔ مجید امجد، "روز رفتہ" کلیات، ص ۱۹۳۔
۱۰۔ مجید امجد، "مرزا" کلیات، ص ۳۸۴۔
۱۱۔ مجید امجد، "روز رفتہ" کلیات، ص ۲۰۲۔
۱۲۔ مجید امجد، "امروز" کلیات، ص ۳۹۸۔
۱۳۔ مجید امجد، "مرزا" کلیات، ص ۳۹۶۔
۱۴۔ مجید امجد، "روز رفتہ" کلیات، ص ۱۹۲۔
۱۵۔ مجید امجد، "مرزا" کلیات، ص ۴۳۹۔
۱۶۔ ایضاً، ص ۴۴۰۔
۱۷۔ ایضاً، ص ۴۴۱۔
۱۸۔ ایضاً، ص ۴۴۲۔
۱۹۔ ایضاً، ص ۴۵۱۔
۲۰۔ ایضاً، ص ۴۸۱۔
۲۱۔ ایضاً، ص ۲۲۵۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۲۲۹۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۲۲۷۔
۲۴۔ ایضاً، ص ۲۲۸۔
۲۵۔ ایضاً، ص ۲۳۱۔
۲۶۔ ایضاً، ص ۲۳۲۔
۲۷۔ ایضاً، ص ۲۳۳۔
۲۸۔ ایضاً، ص ۲۳۹۔

۲۹۔ مجید امجد، "روز رفتہ"، کلیات، ص ۴۳۰۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۴۸۔

۳۱۔ مجید امجد، "شبِ رفتہ"، کلیات، ص ۱۱۴۔

۳۲۔ مجید امجد، "روز رفتہ"، کلیات، ص ۳۵۲۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۳۶۔

۳۴۔ مجید امجد، "شبِ رفتہ"، کلیات، ص ۱۲۰۔

۳۵۔ مجید امجد، "روز رفتہ"، کلیات، ص ۱۸۸۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۱۸۔

۳۷۔ مجید امجد، "شبِ رفتہ"، کلیات، ص ۱۵۱۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۵۵۔

۳۹۔ مجید امجد، "مرے خدا"، کلیات، ص ۵۹۸۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۴۹۹۔

۴۱۔ مجید امجد، "شبِ رفتہ"، کلیات، ص ۱۵۷۔

۴۲۔ مجید امجد، "روز رفتہ"، کلیات، ص ۴۲۷۔

۴۳۔ مجید امجد، "امروز"، کلیات، ص ۴۵۶۔

۴۴۔ مجید امجد، "روز رفتہ"، کلیات، ص ۴۵۳۔

۴۵۔ مجید امجد، "روز رفتہ"، کلیات، ص ۱۸۱۔

۴۶۔ مجید امجد، "شبِ رفتہ"، کلیات، ص ۶۲۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۰۷۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۵۱۔

۴۹۔ مجید امجد، "امروز"، کلیات، ص ۴۱۷۔

۵۰۔ مجید امجد، "مرے خدا"، کلیات، ص ۵۷۲۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۵۹۶۔

۵۲۔ ایضاً، ص ۶۷۹۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۶۸۱۔

۵۴۔ مجید امجد، "روز رفتہ"، کلیات، ص ۱۹۹۔

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۸۸۔

۵۶۔ ایضاً، ص ۴۵۳۔

۵۷۔ مجید امجد، "امروز"، کلیات، ص ۴۵۶۔

۵۸۔ مجید امجد، "روز رفتہ"، کلیات، ص ۴۰۵۔

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۸۹۔

۶۰۔ مجید امجد، "شبِ رفتہ"، کلیات، ص ۱۳۲۔

۶۱۔ مجید امجد، "مرے خدا"، کلیات، ص ۶۴۴۔

۶۲۔ مجید امجد، "شبِ رفتہ"، کلیات، ص ۱۱۱۔

۶۳۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔

۶۴۔ ایضاً، ص ۱۴۸۔

۶۵۔ مجید امجد، "روز رفتہ"، کلیات، ص ۴۴۸۔

۶۶۔ ایضاً، ص ۳۰۶۔

۶۷۔ مجید امجد، "امروز"، کلیات، ص ۳۳۶۔

۶۸۔ مجید امجد، "روز رفتہ"، کلیات، ص ۱۸۵۔

۶۹۔ ایضاً، ص ۲۵۳۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۴۰۵۔

۷۱۔ مجید امجد، "شبِ رفتہ"، کلیات، ص ۵۰۔

۷۲۔ مجید امجد، "روز رفتہ"، کلیات، ص ۲۵۶۔

۷۳۔ ایضاً، ص ۲۶۹۔

مآخذ

امجد، مجید۔ مدون، خواجہ محمد زکریا۔ کلیات مجید امجد۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔

سہیل، سید عامر۔ مجید امجد نقشِ گر ناتمام۔ لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۸ء۔

نیر، ناصر عباس۔ مجید امجد شخصیت اور فن۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء۔